صداقتِ قرآن کریم کی ایک نفسیاتی شہادت

— سلطان احمد اصلاحی علی گڑھ

قرآن کریم نے اپنے تئیں من جانب اللہ ہونے اور غیر انسانی کلام ہونے کے سلسلے میں بہت سے دلائل پیش کئے ہیں۔ ان کے علاوہ یہ بات کہ انسان جس کسی کو چاہے اپنی مدد کے لئے بلالے وہ قرآن جیسی ایک سورۃ بھی پیش کرنے سے عاجز رہے گا۔ (بقرہ۔ ۲۳) نیز یہ کہ سارے انسان اور جن مل کر بھی اگر قرآن جیسا کلام تیار کرنا چاہیں تو ایک دوسرے کی حمایت اور پشت پناہی کے باوجود انہیں اپنے مشن کی ہار ماننی پڑے گی (بنی اسرائیل۔ ۸۸) وغیرہ۔ انہی جیسے دلائل کے ایک بات قرآن یہ کہتا ہے کہ اگر وہ کلام اللہ نہ ہوتا بلکہ کوئی انسانی کلام ہوتا تو اس میں بڑا اختلاف اور تضاد نظر آتا۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ	کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر
كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا	یہ اللہ کے سوا کسی اور کا ہوتا تو اس میں
فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا	بہت اختلاف اور تضاد نظر آتا۔

(نساء۔ ۸۲)

انسانی کلام اختلاف اور تضادات سے مبرا نہیں ہو سکتا اور قرآن اس نقص سے پاک ہے۔ یہ اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ وہ کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ ایک غیر انسانی اور زیادہ صحیح لفظوں میں 'فوق الانسانی' کلام ہے۔ اس مختصر سی آیت میں صداقتِ قرآن کی ایک بہت اہم نفسیاتی شہادت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے آج کی مجلس میں ہم اسی کے مضمرات پر غور کرنے کی کوشش کریں گے۔

انسان اور خدا میں کیا فرق ہے؟ اس کا بہت مختصر اور جامع جواب یہ ہے کہ انسان 'محدود' ہے اور خدا 'لامحدود'۔ انسان کا علم محدود ہے اس کی صلاحیتیں محدود ہیں۔ اس کی رسائی محدود ہے اور اس کی قوتِ فیصلہ اور قوتِ برداشت محدود ہے۔ خدا تعالیٰ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس کا علم لامحدود ہے اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ ہر چیز اس کی دسترس میں ہے اور کوئی چیز اس کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ عدل و توازن کا شاہکار اور اس کی قوتِ برداشت بے پایاں اور اتھاہ ہے۔ کسی شخص کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ظرف میں جو کچھ ہوتا ہے وہی اس سے ٹپکتا ہے۔ نیز یہ کہ ایک شخص کی گفتگو سے اس کی پوری شخصیت کو ناپ لیا جا سکتا ہے ؎

تا مردِ سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

یہ بات جہاں فرد کی نسبت سے درست ہے وہیں اسے پوری جمعیت انسانی کے لئے بطور معیار کے پیش کیا جا سکتا ہے۔ انسان کی اسی محدودیت کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنے کلام میں بےلاگ عدل و توازن کو ملحوظ نہیں رکھ پاتا اور افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی چیز کو قرآن اختلاف اور تفاوت سے تعبیر کرتا ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جس پر پوری تاریخِ انسانی کی شہادت ثبت ہے اور انسانی کلام کے ذخیرے کا ایک ایک حرف اس کی صداقت کا اعلان کرتا ہے۔

انسانی کلام کا جو ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے نمونے طور پر اسے ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جسے ہم انسان کی داخلی فکر یا دوسرے لفظوں میں حقیقت کی معروضی دریافت کا مظہر قرار دے سکتے ہیں۔ دوسرے وہ کلام ہے جو دوسرے انسانوں کے ساتھ انسان کے ردعمل (Re action) کے طور پر وجود میں آتا ہے۔ ان دونوں ہی نوع کے کلاموں میں ہم قدم قدم پر اختلاف و تفاوت کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ بلکہ صحیح تر لفظوں میں اگر ہم انہیں 'مجموعۂ تضادات' کا نام دیں تو بے جا نہ ہوگا۔ سقراط (۴۶۹ - ۳۹۹ ق.م) کو فکر و فلسفہ کا امام کہا جاتا ہے اور حقائق کائنات کی داخلی دریافت کے سلسلے میں اسے 'معمارِ اوّل' کا مقام حاصل ہے۔ اور اس کی عظمت و بڑائی کے اعتراف کے سلسلے میں صرف یہ بات کافی ہے کہ دو سال کی ہزار ہا سال کی گردش کے باوجود انسانی دماغ آج بھی اس کے نتائج فکر سے بے نیاز نہیں ہو سکا ہے ـــــــــ لیکن خود نفس علم کے سلسلے میں اس کا اعتراف ہے کہ یہ

کوئی متعین چیز نہیں جس کا سرا وہ ہر آدمی کے ہاتھ میں پکڑا سکے۔ کارل جیسپر اس کے اس خیال کو ان الفاظ میں نقل کرتا ہے:

IT MEANS THAT EACH MAN MUST FIND KNOWLEDGE IN HIMSELF IT IS NOT A COMMODITY THAT CAN BE PASSED FROM HAND TO HAND, BUT CAN ONLY BE AWAKENED.

(اس کا مطلب ہے کہ ہر آدمی کو علم کی تلاش خود اپنے اندر کرنی چاہیے۔ علم کوئی اثاثہ نہیں ہے کہ اسے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا جاتا رہے۔ اسے تو بس انسان کے اندرون میں بیدار کیا جا سکتا ہے)

چنانچہ آگے خود یہی مصنف اعتراف کرتا ہے کہ گو کہ سقراط کے ساتھ رابطہ انسان کو غور و فکر کے لیے مہمیز کا کام دیتا تھا۔ سقراط کے تمام پرستاروں کا یہی تجربہ تھا۔ لیکن اس کے مرنے کے ساتھ ہی ان کے درمیان اختلافات در آئے اور ہر شخص الگ الگ سمتوں میں سوچنے لگا۔[2]

CONTACT WITH HIM INSPIRED MAN TO THINK, THIS WAS THE EXPERIENCE OF ALL THE SOCRATICS. BUT IMMEDIATELY AFTER HIS DEATH FRAGMENTATION SET IN EACH ONE BEGAIN TO THINK IN A DIFFERENT DIRECTION.

اس سے ملتے جلتے خیالات اس کے شاگرد افلاطون (۴۲۸ - ۳۴۷ ق م) کے بھی تھے جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا انسانی کلام کا دوسرا حصّہ وہ ہے جو دوسرے انسانوں کے ساتھ اس کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آتا ہے۔ اس دائرے میں انسان کی تنگ دامانی اور بھی نمایاں ہے اور در اصل یہی پہلو ہے جسے آج کی گفتگو میں خاص طور پر نمایاں کرنا پیشِ نظر ہے۔ ہٹلر (۱۸۸۹ - ۱۹۴۵ء) ایک عظیم جرنیل ہونے کے ساتھ ایک بے مثال خطیب اور صاحبِ قلم بھی تھا۔ انسانی نسلوں کے سلسلے میں جب وہ رائے زنی کرتا ہے تو ان کے متعلق وہ یہ فتویٰ صادر کرتا ہے۔

---

1. (Karal Jespers : The Great Philosophers, P. 18).

2. Ibid, P. 27).

" RACES ARE NOT ONLY TO BE KEPT DISTINCT, BUT SOME ARE MANIFESTLY SUPERIOR THAN OTHERS APART FROM THE QUESTION OF PURITY. OF THESE THE ARYAN RACE IS AGAIN OUTSTANDING. ALL THE HUMAN CULTURE, ALL THE RESULTS OF ART, SCIENCE AND TECHNOLOGY THAT WE SEE BEFORE US TODAY. ARE ALMOST EXCLUSIVELY THE CREATIVE PRODUCT OF ARYAN."

(نسلوں کو نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے ممتاز ہونا چاہیئے بلکہ بہت سی نسلیں، علاوہ اپنی بے آمیزی کے، دوسری تمام نسلوں سے فائق تر ہیں۔ یہاں بھی ایک نسل دوسری تمام نسلوں سے نمایاں ہے، تمامتر انسانی تہذیب اسی طرح ادب، سائنس اور ٹیکنالوجی کے تمام نتائج جنہیں ہم آج اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھتے ہیں، یہ سب تقریباً تمام کی تمام مخصوص طور پر آریہ نسل کی تخلیق پیداوار کا نتیجہ ہیں۔)

اسی طرح جب اس نے اپنے ملک میں یہودیوں کے خلاف شمشیر انتقام نکالی تو اس قوم کی نسبت سے اس نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ یہ تھے ۔

THE JEWS WERE TO LITTLE BETTER THAN PARASITIC ANIMALS WHICH MUST BE WIPED OUT. AS LONG AS ONE JEW REMAINED IN GERMANY, THE WORLD'S GREATEST CULTURE WAS IN DANGER BECAUSE, HISTORY DEMONSTRATES THAT ALL NATIONS RECEIVING THE JEWS AMONG THEMSELVES AND GIVING THEM THE SAME RIGHTS SOONER OR LATER PERISH FROM THE JEWISH POWER.

(یہودی کیڑے مکوڑوں سے کچھ ہی بہتر ہیں جن کا روئے زمین سے لازماً صفایا ہو جانا چاہیئے۔ جب تک ایک یہودی بھی جرمنی میں باقی رہے گا، دنیا کی اس عظیم ترین تہذیب کو خطرہ لاحق رہے گا۔ اس لئے کہ تاریخ شاہد ہے کہ جن قوموں نے بھی یہودیوں کی اپنے اندر پذیرائی کی اور انہیں اپنے جیسے حقوق عطا کئے وہ جلد یا بدیر یہودی زہر سے ہلاک ہو گئیں)۔

---

3. (Lawrence-C. Wanlass: History of Political Thought, P. 378.) (Ibid P. 379).

ہٹلر کے اوپر فاشزم کی چھاپ لگی ہوئی ہے اس لئے اس کے ان خیالات کو ہوسکتا ہے کہ انتہاپسندی کا آئینہ دار قرار دے کر ٹال دیا جائے، لیکن حالیہ انسانی تاریخ میں کمیونزم کو جو قبول عام ہے اس سے تو کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا لیکن اس نظریئے کا عظیم ترین ہیرو اور مقبول ترین لیڈر لینن (۱۸۷۰ - ۱۹۲۴ء) بھی جب اپنے مزدور پیروؤں کو اپنے مقصد میں آگے بڑھنے کے لئے للکارتا ہے تو اس کی انتہاپسندی بھی اوروں سے کم نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے

"ہم ہر اس اخلاق کو رد کرتے ہیں جو عالم بالا کے کسی تصور پر مبنی ہو یا ایسے خیالات سے ماخوذ ہو جو طبقاتی تصورات سے ماورا رہیں۔ ہمارے نزدیک اخلاق قطعی اور کلی طور پر طبقاتی جنگ کا تابع ہے۔ ہر وہ چیز اخلاقاً بالکل جائز ہے جو پرانے نفع اندوز اجتماعی نظام کو مٹانے کے لئے اور محنت پیشہ طبقوں کو متحد کرنے کے لئے ضروری ہو۔ ہمارا اخلاق بس یہ ہے کہ ہم خوب منضبط اور منظم ہوں اور نفع گیر طبقوں کے خلاف پورے شعور کے ساتھ جنگ کریں۔ ہم یہ مانتے ہی نہیں کہ اخلاق کے کچھ ازلی اور ابدی اصول بھی ہیں۔ ہم اس فریب کا پردہ چاک کرکے رہیں گے۔ اشتراکی اخلاق اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مزدوروں کی مطلق العنان حکومت کو مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کے لئے جنگ کی جائے۔"

"ناگزیر ہے کہ اس کام میں ہر چال، فریب، غیر قانونی تدبیر، حیلے بہانے اور جھوٹ سے کام لیا جائے۔"[1]

کہا جاسکتا ہے کہ یہ خدا بیزار انسانوں کے ردعمل کی مثالیں ہیں جن کا جادۂ اعتدال سے ہٹ کر انتہاپسندی کا شکار ہوجانا بالکل فطری سی بات ہے لیکن قرآن ہی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے، خدا شناس افراد بھی، توفیق ایزدی سے محروم ہوکر جب دوسرے انسانوں کی نسبت اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں تو ان کی بے اعتدالی اور انتہاپسندی بھی دوسروں سے کم نہیں ہوتی ہے۔ قرآن نے یہود و نصاریٰ کی جو داستان بیان کی ہے اس کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل عیاں ہے۔ چنانچہ ان کا خیال تھا کہ جنت میں ان کے سوا کوئی دوسرا داخل نہ ہوگا۔ وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ (البقرہ - ۱۱۱)

اسی طرح وہ اپنے کو مخصوص طور پر اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے تصور کرتے تھے۔

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی: اسلام اور جدید معاشی نظریات / ۶۹

وَقَالَتِ الْیَھُوْدُ وَالنَّصَارٰی نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ (مائدہ - ۱۸)

ایک طرف تو ان کی اپنے بارے میں یہ خوش گمانی تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد جب وہ ایک دوسرے کے خلاف آستینیں چڑھاتے تو ہر ایک دوسرے کو گمراہ قرار دیتا۔ یہود نصاریٰ کو گمراہ کہتے اور نصاریٰ یہود کو گم کردہ راہ بتاتے۔

وَقَالَتِ الْیَھُوْدُ لَیْسَتِ النَّصَارٰی عَلٰی شَیْءٍ وَّقَالَتِ النَّصَارٰی لَیْسَتِ الْیَھُوْدُ عَلٰی شَیْءٍ (بقرہ - ۱۱۳) لیکن آپس کی اس فتوے بازی کے بعد جب مسلمانوں کی طرف عنایت کا رخ کرتے تو انہیں کافروں اور مشرکوں سے بھی زیادہ گیا گزرا بتاتے اور کہتے کہ کافران سے زیادہ راہ یاب ہیں:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتَابِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا ھٰٓؤُلَآءِ اَھْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا۔ (نساء - ۵۱)

اہل کتاب کی ان الزام تراشیوں سے قطع نظر یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ کا سب سے بڑا روڑا یہی یہود و نصاریٰ تھے اور اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی مخالفت میں ایک طرح سے ان کا کردار کفار و مشرکین سے بھی زیادہ گھناؤنا تھا۔ مکہ کے سادہ لوح مشرکین کو اکسانے اور بھڑکانے والے دراصل یہی لوگ تھے اور اسلام اور پیغمبر اسلام کیخلاف سازش کے جو جال بنے جاتے اس کے پس پردہ انہیں کا ہاتھ کام کر رہا ہوتا تھا۔ قرآن اسی نبی اُمّی کی زبان پر نازل ہوتا ہے جو اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں ان کی سازشوں کا ستم خوردہ ہے۔ لیکن کسی ایک مقام پر وہ ان کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں کہتا جو جادۂ اعتدال سے ہٹی ہوئی ہو اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ جوش انتقام میں آکر من حیث القوم ان کو [illegible] کرنے لگے وہ ان میں سے مجرم صرف انہی لوگوں کو قرار دیتا ہے جو واقعی مجرم ہیں اور جو جادۂ حق پر ہیں وہ علی الاعلان ان کی سلامت روی کا اعتراف کرتا ہے چنانچہ وہ صاف صاف کہتا ہے کہ سارے اہل کتاب ایک سے نہیں۔ ان میں بہتیرے ہیں جو سیدھی راہ پر قائم ہیں:

لَیْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اُمَّۃٌ قَآئِمَۃٌ یَّتْلُوْنَ اٰیَاتِ اللّٰہِ اٰنَآءَ اللَّیْلِ وَھُمْ یَسْجُدُوْنَ۔ (آل عمران - ۱۱۳)

اسی طرح وہ کھلے لفظوں میں اعتراف کرتا ہے کہ اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ہیں جو اس

کے نازل کردہ کلام پر ایمان رکھتے ہیں۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ۔

(ایضا۔۱۹۹)

اسی طرح جب وہ ان کے جرائم بیان کرتا ہے تو ایک ہی سانس میں پوری قوم کو مجرموں کے کٹہرے میں لا نہیں کھڑا کرتا ہے۔ بلکہ صرف انہی کو مجرم بتاتا ہے جو واقعی مجرم ہیں۔ چنانچہ جہاں وہ ان کی بد دیانتی اور حرام خوری کا تذکرہ کرتا ہے وہیں وہ اس کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ ان میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جن کا دامن اس جرم سے پاک ہے اور وہ امانت کا پاس و لحاظ رکھتا ہے۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا (الیضاً۔۷۵)

دوسرے مقامات پر بھی اس کا یہی حال ہے کہ جو لوگ واقعی مجرم ہیں وہ صرف انہیں کو مجرم گردانتا ہے۔

(۱) وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ (البقرہ۔۱۰۹)

(۲) وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ (آل عمران۔۶۹)

(۳) وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔

(الیضاً۔۷۲)

(۴) اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كَافِرِيْنَ۔ (الیضاً۔۱۰۰)

چنانچہ خود آیت زیر بحث جس سے پہلے اہل کتاب منافقین کا تذکرہ چل رہا ہے۔ وہاں بھی اس نے ان کی ریشہ دوانیوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے 'کچھ ہی لوگوں' کو اس جرم کا مرتکب بتایا ہے اور انتقام کے نشے میں پوری قوم کو اس میں ملوث نہیں قرار دے دیا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى

اللّٰہِ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا ۝ (نساء - ۸۱)

یہی حال مشرکینِ مکّہ کا بھی تھا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر طرح طرح کے الزامات کی بوچھاڑ کرتے کبھی آپؐ کو 'ساحر' اور 'مجنون' قرار دیتے۔ کبھی کہتے کہ معاذاللہ آپؐ پر کوئی آسیب سوار ہو گیا ہے۔ کبھی کہتے کہ یہ قرآن انہیں کوئی دوسرا املاء کرا دیتا ہے۔ کبھی کہتے کہ اگر یہ قرآن اترنا ہی تھا تو مکّے اور طائف کے کسی بڑے سردار کے اوپر اترا ہوتا۔ کبھی کہتے کہ اگر یہ نبی ایسا تو ان کے اوپر خزانے کی بارش کیوں نہیں ہوتی اور ان کے جلو میں فرشتے کیوں نہیں چلتے۔ کبھی کہتے کہ کیا یہی پھٹے حال لوگ رہ گئے تھے جن پر اللہ کو اپنا خصوصی انعام کرنا تھا۔ کبھی کہتے کہ اگر یہ کوئی بھلی بات ہوتی تو بھلا یہ ہم سے آگے کیسے نکل سکتے؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان تمام یاوہ گوئیوں کو سن کر رسولِ خدا کبھی قابو سے باہر نہیں ہوتا اور ان کے اوپر کبھی کوئی جوابی الزام عائد نہیں کرتا۔ بلکہ انہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہے اور صرف اپنی پوزیشن کو واضح کر کے خاموش ہو جاتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ۔ (سباء - ۴۶)

انسانی کلام کی انہی بے اعتدالیوں اور اسی اختلاف و تفاوت پر آپ دوسرے تمام انسانی کلاموں کو قیاس کر سکتے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے کتنی گہری بات کہی ہے۔ آیت زیرِ بحث پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"یعنی مخلوق ہر حال میں اس حال کے موافق بولتا ہے۔ غصّے میں مہربانی والوں کی طرف دھیان نہیں رہتا اور مہربانی میں غصّے والوں کی طرف۔ دنیا کے بیان میں آخرت یاد نہ آوے اور آخرت کے بیان میں دنیا۔ بے پروائی میں عنایت کا ذکر نہیں اور عنایت میں بے پروائی کا۔ تو اس حال کا کلام سنے

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

اتا ۶: ان آیتوں کے حوالے بالترتیب یہ ہیں۔ ذاریات ۵۲ - ھود ۵/۷ - فرقان ۵ - زخرف ۳۱ - ھود ۱۲ - انعام ۵۳

۷ احقاف ۱۱